Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"زیادہ باتیں مت بناؤ۔ صرف میری ذاتی عینک تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اِدھر لاؤ۔"

"نہیں دیتا۔"

چند لحظے چشمہ چھیننے کی کوشش کرنے کے بعد نسرین ہار کر بیٹھ رہی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ سرفراز نے جیب سے رومال نکال کر اُس کی آنکھوں پہ رکھنا چاہا تو نسرین نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر قمیض کے دامن سے آنکھیں خشک کرلیں۔

"یہ لو،" سرفراز پشیمانی سے بولا۔ "آئی ایم سوری۔"

نسرین نے چشمہ لے کر آنکھوں پہ لگا لیا۔ مگر وہ لیٹی نہیں۔ پہلو صوفے کی پشت سے ٹیکے، سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ اُس کا بدن کسی بے جان شے کی مانند ڈھیلا پڑا تھا جس سے اُس کی پشت کی گہری کمان بنی تھی۔ سرفراز نے اُس کی پشت پہ ہولے سے ہاتھ رکھا۔

"نسرین؟"

"ہُوں۔"

"کوئی پرابلم ہے؟ مجھے بتاؤ۔"

نسرین نے خاموشی سے سر جھٹکا۔

"نسرینی، مائی لو،" سرفراز نے کہا، "تمہیں اِس حالت میں دیکھ کر مجھے دُکھ ہوتا ہے۔"

نسرین نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا اور کئی لمحوں تک ٹھہری ہُوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی، "تُم واقعی جاننا چاہتے ہو؟"

"ہاں، قسم لے لو جو مذاق کر رہا ہوں۔ میرے دِل کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

کمرے کی نیم روشنی میں سرفراز کو سیاہ شیشوں کے پار نسرین کی آنکھیں مدہم سی نظر آ رہی تھیں۔ اُس کا چہرہ حسب معمول سپاٹ تھا جس سے کچھ بھی ظاہر نہ ہوتا تھا۔

"میرے ماں باپ گاؤں سے آئے تھے؟" پھر اُس نے کہا۔

"تمہارے والدین؟" سرفراز نے بے خیالی سے پُوچھا۔ "پھر تم اَپ سیٹ کیوں ہو؟"

"باسٹرڈ کرنل،" نسرین نے یُوں کہا جیسے گلے کی گندگی نکال رہی ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں؟" سرفراز اچنبھے سے بولا۔ "کرنل نے کیا کیا؟ تمہاری اُس سے رشتہ داری نہیں ہے؟"

"یہ تم سے کس نے کہا؟"

"میرا خیال ہے شاید تم نے ہی ذکر کیا تھا۔"

"تم نے فرض کر لیا ہے۔ میں نے تم سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔"

"آئی ایم سوری۔ میرا خیال تھا۔۔۔۔۔"

"ہم اِن لوگوں کے مزارعے ہیں۔ میرے ماں باپ گھر کے اندر بھی نہیں آ سکتے۔"

سرفراز نے اُسے اَپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔ وہ سرفراز کے ہاتھ آہستگی سے پرے کر کے صوفے سے اُٹھ کھڑی ہُوئی اَور جا کر کُرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ مُنہ موڑ کر خلاء میں دیکھ رہی تھی۔ کالے شیشوں کے مقابل اُس کی جلد کی پیلاہٹ نمایاں ہو رہی تھی۔ سرفراز اُس کی جلد پہ ہمیشہ متعجب ہوتا تھا۔ اُس نے ایسی شفاف جلد کسی اَور کی نہ دیکھی تھی۔ نسرین کے بالوں کی ایک سیاہ لٹ اُس کے گال پہ لٹکی تھی۔ سرفراز کا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ وہ اُس مبتلا بدن کو اَپنے بازوؤں میں سنبھال کر چھپا لے، مگر اُس پتھر کی سی شبیہہ کو دیکھ کر وہ اَپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔

سرفراز کے دِل میں جہاں گہری ہمدردی کا جذبہ اُبھر رہا تھا، وہاں اُسے ایک عجیب سے تحفظ کا احساس بھی ہو چُکا تھا، جیسے میدانِ جنگ میں دُشمن کی کمزوری کو بھانپ کر ہوتا ہے۔ اِس احساس سے اُس کے دل کے چور کو کچُھ صبر آ گیا تھا، گویا اِس لڑکی سے اب اُسے کوئی خدشہ نہ رہا تھا۔ نسرین کا درجہ کمتر ہو چُکا تھا، جس نے اِس تعلق کو کسی حد تک جائز بنا دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ، اَپنے اندر کھٹکتی ہُوئی خرابی کو اُس نے ایک نظر نسرین کے دِل میں پلتے ہُوئے دیکھ لیا تھا۔ جس سے اُسے نسرین کے ساتھ ایک انوکھی یکجہتی کا احساس ہوا تھا، جیسے کہ روحوں کی اِس بدعنوانی میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ منضبط ہوں۔

اب جب کہ اُس کی یُونٹ حیدر آباد جا رہی تھی تو جدائی کے خیال سے سرفراز کا دِماغ جل رہا تھا۔

"اب تم اِتنی دُور چلے جاؤ گے؟" نسرین نے سپاٹ لہجے میں پُوچھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں۔ ہو سکتا ہے اِس سے بھی آگے چلا جاؤں۔"

"اِس سے بھی آگے؟" نسرین نے کہا۔ "اس سے آگے تو کراچی ہے۔"

"وہاں بھی ہماری عملداری ہے۔"

"سرفی؟" کچھ دیر کے بعد نسرین نے کہا۔

"کیا ہے۔"

"احتیاط سے رہنا۔"

نسرین نے پہلی بار اُس کے بارے میں کسی قسم کی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ مگر اُس کے لہجے میں تردد کی کوئی جھلک نہ تھی۔ نسرین کی یہی خاصیت تھی جو سرفراز کی خواہش کو مُستقِل الاؤ کی حدت پہ رکھتی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"وہ گڑ بڑ والے علاقے ہیں۔"

"گڑ بڑ والے علاقوں میں ہی تو ہماری ضرورت ہوتی ہے۔"

"میرا مطلب ہے تم لوگوں کے اَپنے اَندر بھی گڑ بڑ ہے۔ احتیاط سے رہنا۔"

"کیا بات کر رہی ہو، میں نہیں سمجھا۔"

"تُمہارے دوست گرفتار کئے جا رہے ہیں۔"

سرفراز چونک اُٹھا۔ "تُمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"بُھول گئے ہو؟ خُود ہی تو بتایا تھا۔ تُم نے کیپٹن سلطان کا نام لیا تھا۔"

"ہاں، وہ،" سرفراز بولا۔ "سلطان میرا دوست نہیں ہے۔ انڈیا میں ہمارا ساتھی تھا، بس۔ باقی لوگوں کو میں، صرف دور سے جانتا ہُوں۔ میرا اُن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ احتیاط کی ضرورت اُن لوگوں کو ہوتی ہے جو اپنا کنٹرول کھو دیتے ہیں۔"

"اور تُم اپنے کنٹرول میں ہو؟" نسرین آنکھیں چمکا کر بولی۔ صرف یہی ایک نشانی تھی جس سے اظہار ہوتا تھا کہ وہ شرارت پر آمادہ ہے۔

"ہاں، میں مکمل کنٹرول میں ہُوں۔ یہ دیکھو۔ تُم بھی میرے کنٹرول میں ہو۔"

"سرفی چھوڑو مجھے۔۔ ہر موقعہ بے موقعہ ہاتھ چلانے لگتے ہو۔"

"خود مجھے بھڑکاتی ہو اَور پھر میرے ہاتھ پکڑتی ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں بھڑکاتی ہوں؟ تُمہیں بھڑکانے کے لِئے کیا محنت کی ضرورت ہے؟ ہر وقت بھڑکے رہتے ہو۔ میں تو تُمہیں احتیاط کی نصیحت کر رہی ہُوں۔"

"تو کیا میں محتاط نہیں ہوں؟ جب بھی تُم سے ملتا ہوں تو کیا احتیاط نہیں برتتا؟"

"سرفی بڑے بے شرم ہو۔"

"احتیاط برتنے میں بے شرمی کی کیا بات ہے؟"

"ہاتھ پرے کرو۔ تُمہیں تو کسی بات کی تمیز ہی نہیں ہے۔ دیکھو پھر میں تمہیں سرفراز اکہنا شُروع کر دوں گی جیسے تُمہاری بھابھی کہتی ہے۔"

"تُمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"تُم نے۔"

"افسوس صد افسوس۔ کیسی کیسی باتیں میں نے تُمہیں بتا دی ہیں۔"

"اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو اِن باتوں کو۔"

"کن باتوں کو؟"

سرفراز کے دِل میں ایک ہوک تھی، کہ وہ دور جا رہا تھا اور نسرین اِسے معمول کی بات تصور کر رہی تھی۔ "تُمہیں پتا ہے کہ میں اب تُم سے مِل نہیں سکوں گا؟"

"کیوں، پھر پی۔او۔ڈبلیو ہو جاؤ گے؟"

"نہیں، مگر روز روز تو نہیں آ سکتا۔"

"اب کوئی روز روز آتے ہو؟"

"ہفتے میں ایک بار تو آ جاتا ہُوں۔"

"وہاں سے کتنی دیر میں آیا کرو گے؟"

"کچھ پتا نہیں۔ اِٹ ڈپنڈز۔"

"اَون واٹ؟"

"چُھٹی۔ جیب۔ حالات۔"

"تینوں چیزیں تُمہارے اختیار سے باہر ہیں۔"

سرفراز نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔ "تُم میرے اختیار میں ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نسرین نے نہایت دھیمی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "ہاں،" گویا اِثبات میں جواب دے رہی ہو اَور اِس بارے میں سنجیدہ بھی نہ ہو۔

سرفراز کا لہجہ یکدم بدل گیا۔ "ایسے نہیں،" وہ بولا۔ "سچ سچ بتاؤ۔"

نسرین کی آنکھوں میں بھی گہرائی کی جھلک ابھر آئی تھی۔ وہ چند لمحے تک خاموش بیٹھی ایک تار سرفراز کو دیکھتی رہی، پھر بولی، "کون کسی کے اختیار میں ہوتا ہے سرفی۔"

"کیوں نہیں ہوتا،" سرفراز نے کہا۔ "سب کچھ اختیار میں ہوتا ہے۔ صرف ارادے کی بات ہے۔"

"کس کے ارادے کی؟ میرے ارادے کی، تمُہارے کی، یا کسی دُوسرے کے ارادے کی؟"

"کس دوسرے کی؟"

"ہر ایک کے اُوپر کسی دُوسرے کا سایہ ہوتا ہے۔"

"نان سینس،" سرفراز نے کہا۔ "یہ کتابی فلسفے ہیں۔ آدمی خُود اپنے ارادے کا مالک ہوتا ہے۔"

نسرین کے چہرے کا تاثر فوراً اپنی اصلی حالت پہ آگیا۔ وہ بے معلوم سے انداز میں ہنس کر خاموش ہو رہی۔ سرفراز کے دِل کی خلش نہ تھمی۔ وہ یہ دیکھنا اور سننا چاہتا تھا کہ نسرین اُس کی جدائی کے خیال سے آزردہ خاطر تھی، اَور گو وہ نسرین کی خصلتوں سے واقف تھا، تاہم اپنے تمام تر اندیشے کے خلاف، اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ جب تک وہ جہلم میں تھا اُسے اِس بات کی تسلی رہی تھی کہ وہ کسی وقت بھی اپنی خواہش کے مرکز تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ مگر جب سے اُسے پتا چلا تھا کہ وہ چار چھ سو میل دور جا رہا تھا اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا خدشہ آخرکار سچ ثابت ہونے والا تھا، کہ نسرین جس پہ کبھی اُس کی مکمّل عملداری نہ رہی تھی، اب اُس کے ہاتھ سے نِکلی جا رہی تھی۔ اُس کی بیتابی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی گئی۔

"تُم کیا کرو گی؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"کیا مطلب کہ کیا کرونگی؟"

"مُجھے یاد کرو گی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں۔"

"اپنی سہیلیوں اَور ہم جماعتوں سے ملتی رہو گی؟"

"اور نہیں تو کیا۔"

"تمہاری زندگی یوں ہی چلتی رہے گی؟"

"ہاں ہاں،" نسرین زِچ ہو کر بولی۔

"اور کیا کروگی؟"

نسرین اچانک مُنہ کھول کر ہنس دی۔ "تُمہیں یاد کرتے کرتے شہید ہو جاؤں گی۔"

"مذاق مت کرو۔"

"مذاق کون کر رہا ہے؟"

"ایک بے وجہ غصہ سرفراز کے دِماغ کو چڑھ رہا تھا۔ نسرین کی ہنسی ٹھٹھا بن کر اُسے لگی تھی۔ اُس نے لپک کر نسرین کے کندھے دبوچ لِئے اَور اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"میرا مذاق مت اُڑاؤ،" وہ چیخ کر بولا۔

سرفراز کے طاقتور ہاتھوں کی گرفت میں نسرین ایک نازک پرندے کی مانِند ٹھٹھر کر رہ گئی۔ سرفراز نے دوبارہ اُسے جھنجوڑا تو گردن پر اُس کا سر یوں آگے پیچھے جھٹکے کھانے لگا جیسے کھلونے کا سر اپنی کلوں پر ہلتا ہے۔ جھٹکوں کے درمیان نسرین کی ہکلاتی ہوئی زبان سے الفاظ رُک رُک کر نِکل رہے تھے۔

"سرفی--- سرفی--- میں م م مذاق نہیں---- چھوڑ دو مُجھے---- تُم پ پ پاگل----" سرفراز کے سر پر بھوت سوار تھا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر ایک طمانچہ نسرین کے گال پہ مارا۔ نسرین ٹھٹک کر بت کی مانِند ساکت ہو گئی۔ آنسو اُچھل کر اُس کی آنکھوں پہ چھا گئے، جیسے چپت کی ضرب نے اُس کے بدن سے کشید کیے ہُوں۔ دونوں سناٹے کے عالم میں آمنے سامنے کھڑے ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ دفعتاً سرفراز کا غصہ کافور ہو گیا۔ وہ ایک ہزیمت خوردہ جانور کی مانِند بازو لٹکائے نسرین کے سامنے کھڑا تھا۔

پھر وہ اچانک گڑگڑانے لگا۔ "مُجھے معاف کر دو نسرین۔ خُدا جانتا ہے مُجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ خُدا کے لئے----" اُس نے نسرین کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔ نسرین اَیسے اچھل کر دور ہٹ گئی جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ سرفراز نے دوبارہ اُسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پکڑ لیا اَور اُسے باہوں میں سمیٹنے کی کوشش کرنے گا۔ اُس کے بازو نسرین کی کمر کے گرد کسے تھے۔ نسرین اپنا بدن اس سے جدا نہ کر سکی، مگر اُس نے اپنے ہاتھ سرفراز کی چھاتی پہ جما کر پورے زور سے اُس کے چہرے کو پیچھے دھکیل دیا۔ اِسی کشمکش میں دونوں بستر پہ جا گرے۔ سرفراز بستر سے کھسک کر گھٹنوں کے بل فرش پہ بیٹھ گیا۔ اپنے ہاتھوں میں نسرین کے ہاتھ تھامے، وہ آنکھیں اُٹھا کر بلبلانے لگا۔

"میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے تمہارا گناہ کیا ہے۔ خُدا کے واسطے مجھے معاف کر دو، مجھ پر رحم کرو، میری جان تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

نسرین کا جسم لکڑی کی طرح اکڑا تھا۔ اُس کے زرد گال پہ سرفراز کی اُنگلیوں کے سرخ نشان اُبھر آئے تھے، اَور اُس کے ہونٹ بھنچے ہُوئے تھے۔ اُس کی نظر سامنے ایک نقطے پہ ٹھہری تھی۔ "نسرین، کچھ مُنہ سے بولو، مجھ سے بات کرو، مجھے تُم سے ایسی۔۔۔۔ ایسی محبت ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا، میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آئی لو یُو، لو یُو، لو لو لو یُو۔۔۔۔" نسرین کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے۔ کئی مِنٹ تک وہ سرفراز کی لجاجت بھری آواز سنتی رہی۔ پھر اُس نے نرمی سے اپنے ہاتھ سرفراز کے ہاتھوں سے الگ کئے اَور دونوں ہاتھ سرفراز کے سر پر رکھ کر اُسے اپنی گود میں چھپا لیا۔

وہ اِسی انداز میں بیٹھے تھے کہ جمال نے ہولے سے اپنے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دونوں جلدی سے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ نسرین نے اپنے کپڑوں پہ ہاتھ پھیر کر اُنہیں سیدھا کیا اَور بستر سے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھی۔ سرفراز نے ہاتھ سے اپنے بال بٹھائے، جیب سے رومال نکال کر چہرہ خشک کیا اَور جا کر دروازہ کھول دیا۔

"ائی ایم سوری،" جمال نے کمرے میں داخل ہوکر کہا۔ "میں ریکٹ لینے آیا ہُوں۔"

"ہم تو بیٹھے باتیں کر رہے ہیں،" سرفراز نے کہا۔ "آؤ بیٹھو۔"

"زلفی سے ایک سیٹ کی شرط لگی ہے،" جمال کرسی پہ بیٹھتے ہُوئے بولا۔

"کتنے کی؟"

"سو روپے کی۔"

"بس؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پیسوں کی بات نہیں، ذرا اُس کی ہوا نکالنی ہے۔ جب سے اُس نے مار کر کے ساتھ کھیلنا شروع کیا ہے بہت بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہا ہے۔"

کچھ دیر تک وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نسرین اپنے گال پہ ہتھیلی رکھے کہنی گھٹنے پہ ٹکائے، خاموش بیٹھی رہی۔ پھر جمال اُٹھ کر اپنا ٹینس کا کٹ اِکٹھا کرنے لگا۔ سرفراز نے اجازت چاہی۔

"یار گاڑی تو منگوا دو،" سرفراز نے کہا۔

"باہر کھڑی ہے۔" جمال نے دروازے سے سر نکال کر ڈرائیور کو ہدایت کی وہ "کیپٹن صاحب کو ڈراپ" کر آئے۔

سرفراز ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پہ بیٹھا اور نسرین پچھلی سیٹ پہ تھی۔ سارا راستہ خاموشی میں طے ہوا۔ سرفراز کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے۔ جب نسرین کے یونیورسٹی گیٹ پر جیپ رُکی تو سرفراز نے نیچے اُتر کر اپنی سیٹ اُٹھا دی۔ نسرین جھک کر باہر نِکلی تو اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کے لبوں پر بے معلوم سی مسکراہٹ تھی۔ اُس کی رنگت میں سرخی کی جھلک تھی اور گال کے نشان ماند پڑ گئے تھے۔ میکانکی طور پر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر رخسار کو چھوا۔

"فون کرنا،" وہ سرگوشی میں بولی اور مڑ کر گیٹ کے اندر چلی گئی۔

کچھ دور جا کر جیپ ایک چوراہے پر گاڑیوں کے بے ہنگم جمگھٹے میں پھنس گئی۔ بائیسکل سے لے کر ٹرک تک ہر نوع کی سواری ایک دُوسرے کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ چوراہے میں دو تین سپاہی اور ایک سارجنٹ بازو لہراتے، سیٹیاں بجاتے ہُوئے دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ ٹریفک کا عفریت ہر طرف پھنکار رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا یہ گانٹھ کبھی نہ کھلے گی۔ سرفراز اُکتایا بیٹھا ڈیش بورڈ پر بیتابی سے اُنگلیاں بجا رہا تھا کہ ایک سپاہی نے جیپ کے دروازے پر ہاتھ مارا۔ سرفراز نے دروازہ کھولا۔ پہچاننے میں اُسے ایک دو سیکنڈ لگے، پھر وہ ہنس کر بولا۔ "اوئے عباس؟"

عباس اُس کے سامنے کھڑا دانت نکال کر ہنس رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر سرفراز کی نظر اُس کی رانوں کے بیچ میں گئی، جہاں اُس کی خاکی پتلون کے اندر ایک بغچہ سا بنا ہوا تھا۔

"تو اِدھر کیا کر رہا ہے عباس؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"دیکھ لو، سڑکوں کے سردار بنے ہُوئے ہیں۔ آؤ کوئی چاء پانی ہو جائے۔"

"چھوڑ یار، بس تو اِدھر سے ہمیں نکال۔ میں جلدی میں ہُوں۔"

عباس نے ایک نظر سرفراز کے باوردی ڈرائیور کو دیکھا اور اُس کا سینہ فخر سے پھول کر چوڑا ہو گیا۔ اُس نے زور شور سے تین چار بار سیٹی بجائی۔ سارجنٹ نے اِدھر دیکھا تو عباس نے ہاتھ کے تیز تیز اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا۔

"کیا بات ہے؟" سارجنٹ نے قریب آ کر پُوچھا۔

"یہ کرنل صاب ہیں،" عباس نے سرفراز کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بتایا۔

سارجنٹ نے شبے کی نظروں سے سرفراز کو دیکھا، جو سادہ کپڑوں میں تھا۔ عباس نے سارجنٹ کی نظریں دیکھ کر باوردی ڈرائیور کی جانب اِشارہ کیا اور فوجی جیپ پر ہاتھ مار کر بولا،

"کرنل صاب میرے بھائی ہیں۔"

سرفراز سارجنٹ کو دیکھ کر مسکرایا۔ سارجنٹ کے چہرے پہ ٹریفک کی بدنظمی کی ہراسانی پھیلی تھی۔ عباس اور سارجنٹ نے مِل کر سیٹیاں بجائی اور بازو لمبے کر کے چاروں طرف اِشارے کرنے شروع کر دیئے۔ عباس اردگرد کی گاڑیوں پہ ہاتھ مار مار کر چیخ رہا تھا،

"کرنل صاب کی جیپ کو نکلنے دو۔ رستہ چھوڑو۔ فوجی ڈیوٹی ہے۔ جلدی کا ماملہ ہے۔ اِدھر موڑو، بس بس، اب رورس کرو۔ بس۔ باس۔ باآآس اب پورا موڑو پورا، پورا، پورا، چلو نِکل جاؤ۔" عباس دُوسری گاڑی کو نکال کر سرفراز کے ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ "آؤ ڈرائیور صاب، میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ---- چوہدری صاب آپ کدھر گھس کر جا رہے ہیں، ساری سڑک بند کر دی ہے، کچھ خیال کرو----"

"ایک گھنٹے سے پھنسے ہُوئے ہیں بھئی، نہ آگے رستہ ہے نہ پیچھے۔ آپ لوگوں نے تماشا لگایا ہوا ہے۔"

"حوصلہ کر چوہدری، گُسّے کا مکام نہیں۔"

"کرنل صاب کو جلدی ہے تو ہم کیا آلو چھولے بیچنے آئے ہیں، ہم بھی امرجنسی میں جا رہے ہیں۔"

"ملٹری افیسر سے اُوپر کوئی امرجنسی نہیں،" عباس رعب سے بولا، "چلو نکلو، چلان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کروانا ہے؟"

"گاڑیوں پہ ہاتھ مارتا، سائیکل سواروں کو دھکیلتا، چیختا چلاتا اور سٹیاں بجاتا ہوا عباس آگے پیچھے بھاگتا رہا۔ سرفراز ہونٹوں پہ مسکراہٹ لیئے عباس کی کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ میں رستہ صاف ہوگیا۔ سرفراز کا ڈرائیور نکلنے لگا تو عباس بھاگ کر برابر آ گیا۔ ڈرائیور نے جیپ کی رفتار کم کردی۔ عباس جیپ کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ پتلون کے آسن میں اُس کا بچہ گتھل متھل کر رہا تھا۔ سرفراز نے دیکھا عباس خاموشی سے ہنس رہا تھا اور اُنگلی سے اپنے شانے کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اُس کے کندھے پر ایک سرخ فیتی لگی تھی۔ سرفراز ہنس پڑا۔

"ہاں،" وہ بولا، "مبارک ہو۔ مجھے چاچے سے خبر مل گئی تھی۔"

"گھر گئے تھے؟"

"پچھلے جمعے کو گیا تھا۔"

"سب ٹھیک ٹھاک تھے؟"

"سب ٹھیک تھے۔ سنا تھا تیری تبدیلی بھی ہو گئی ہے۔"

"ہاں۔ باڈر پر،" عباس نے کہا۔ "آڈر آ گئے ہیں۔"

"چلو، تیری مرضی کی جگہ مل گئی ہے۔"

"پھر چاء پانی نہ ہو جائے؟"

"نہیں، میں جلدی میں جا رہا ہوں۔ تو اپنا کام کر۔"

"پکی بات ہے؟"

"ہاں ہاں۔" سرفراز نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور جیپ بھگا کر لے گیا۔ عباس وہاں کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔ سرفراز سیٹ پہ دراز، لبوں سے ہلکی ہلکی سیٹی بجانے لگا۔ نسرین کے الوداعی انداز، اور عباس کے ساتھ اچانک ملاقات سے اُس کی طبیعت کچھ کھل گئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جمیلہ کی شادی شُروع تھی۔

چاچے احمد کے گھر کے صحن کی ایک دیوار مدت ہُوئی درمیان سے ٹوٹ چکی تھی۔ اُس کا گھر چک بیاسی کے ایک سرے پر واقع تھا اَور دیوار سے ملحقہ ایک کھلا میدان تھا جس کے مالکانہ حقوق کا پچھلے اٹھائیس برس میں فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔ اِس ساٹھ ستر مرلے قطعۂ زمین کے لِئے تین دعویداروں، راٹھوروں، قریشیوں اَور ڈوگروں کے درمیان مقدمے بازی چل رہی تھی جو اب دُوسری تیسری نسل تک آ پہنچی تھی۔ چنانچہ اِس میدان کی نہ حد بندی ہو سکی تھی نہ ہی اِس پہ کوئی عمارت تعمیر ہُوئی تھی۔ صرف اس کے کناروں پہ غلاظت کے ڈھیر لگے تھے۔ یہ دیسی کھاد کے ذخیرے تھے جو گلے سڑے پتوں اَور اِنسانی و حیوانی فضلات کا مرکب تھے۔ سفیدہ زمین کے برعکس، اِن کھادوں کی ملکیت کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ روڑی کی ڈھیری رحمن بھٹی کی تھی اور وہ علی راٹھور کی اَور تیسری فلاں کی تھی، اَور مالک کے سوا اس میں کوئی دُوسرا دخل اندازی نہ کرتا تھا۔ مالکان مقرر موسموں میں اپنے اپنے حصوں سے کھاد اُٹھا کر فصلوں میں بکھیرتے رہتے تھے۔ گو یہ ذخیرے گندگی اَور بدبو کے ڈھیر تھے، مگر ماحول کھلا ہونے کی وجہ سے گردوپیش کے گھروں کے لِئے ناقابل برداشت حد تک تکلیف کا باعث نہ بنتے تھے۔ چاچے احمد کے صحن کی مسمار شدہ دیوار کے رستے گاؤں کی کچی سڑک تک جانے میں صرف چند قدم کی سہولت ہوتی تھی، پھر بھی گھر کے سب لوگ عموماً اِسی رستے سے آمدورفت رکھتے تھے، تاآنکہ اُنہیں گلی میں دُوسری طرف جانے کی ضرورت پیش نہ آئے، جس صورت میں وہ پھر گھر کا اصل دروازہ استعمال کرتے تھے۔

بارات کے بیٹھنے کے لِئے چاچا احمد اُسی میدان میں زمین پر دریاں بچھانے کا انتظام کرکے اپنے تئیں مطمئن ہو بیٹھا تھا۔ اعجاز نے گندگی کو دیکھ کر ناک مُنہ چڑھایا، مگر چپ رہا۔ سرفراز کو شادی میں شریک ہونے کے لِئے چُھٹی نہ مِل سکی تھی۔ عباس چُھٹی لے کر پہنچا تو اُس نے سارے کام رُکوا دیئے۔ نور پور سے دریاں ریڑوں پر لد کر آئیں تو عباس نے اُنہیں صحن میں اُتروا دیا۔ ریڑوں کو اُس نے کرسیاں لانے کے لئے واپس بھیج دیا۔ گول گول لپٹی ہُوئی دریاں دِن بھر صحن میں پڑی رہیں۔ دسترخوانوں کے بندھے ہوئے گٹھے اُن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اُوپر رکھے گئے تھے تاکہ مٹی سے خراب نہ ہُوں۔ شام کے وقت جب چاچا ایک بچھڑی حلال کرنے کے لِئے خرید کر لایا تو عباس نے اُس کا سامنا کیا۔

"ابا تجھے، یہ ڈھیریاں نہیں دکھائی دیں؟"

"اِدھر ہی پڑی ہوتی ہیں۔ تو نے پہلے نہیں دیکھیں؟"

"مخول کی بات نہیں ابا۔ اِن کے سامنے بٹھا کر کھانا کھلاؤ گے؟"

"اوئے روڑی ہی ہے، کوئی زہر تو نہیں ہے۔"

"ابا گند ہے گند۔ یہ زہر ہوتا ہے۔ ہوا چل گئی تو اُڑ کر مُنہ میں آئے گا۔"

"چھوٹا موٹا تل تنکا کچھ نہیں کہتا۔ اپنی بیری کے نیچے والی روڑی یاد ہے؟"

"ہاں۔"

"وہاں سے بیر چن چن کے کھایا کرتا تھا کہ نہیں؟ تیری جان کو تو کوئی روگ نہیں لگا۔"

"ابا تو کس زمانے کی بات کرتا ہے۔ چل چھوڑ۔ میں اِس کا اِنتظام کرتا ہُوں۔ کرسیوں کے لئے میں نے ریڑے بھیج دیئے ہیں۔"

"کیوں، سرورے کے چوتڑوں کو دریاں چبھتی ہیں؟"

"ابا، ابا تو سمجھتا کیوں نہیں۔ تائے سرورے کی بات نہیں ہے۔ اکتی عہدے دار ہے۔ اُس کے تعلق والے لوگ آئیں گے۔ سرکاری ملازمین وغیرہ۔"

"تیرے اَیرہ وغیرہ کے لِئے ایک طرف پلنگ رکھ دیں گے۔ اُوپر کھیس بچھا دیں گے۔"

"وہ بھی رکھوالیں گے۔ کرسیاں ضروری ہیں،" عباس نے کہا۔

"کرسیوں کے لِئے میزیں کدھر سے آئیں گی؟"

"وہ بھی آ رہی ہیں۔ میں پہلے اس کا بندوبست کرتا ہوں،" عباس نے گندگی کی جانب اشارہ کرکے کہا۔

"شہر میں پہنچ کر سب اب باؤ ہو گئے ہیں،" چاچا بڑبڑایا۔

عباس نے حسن اَور حسین کو روڑی کے مالکان کے پیچھے دوڑایا۔ پولیس کا ملازم ہونے کے واسطے سے گاؤں کے اندر عباس کی ایک حیثیت تھی۔ کچھ ہی دیر میں تین چار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آدمی اکٹھے ہو کر آ گئے۔

"چوہدری باس،" مدعا سن کر ایک بولا، "ہمارے کان میں حرف پڑ جاتا تو ایک پہر میں صفایا کر دیتے۔ چوہدری احمے نے ایک بول مُنہ سے نہیں نکالا۔ یہ کوئی بات ہے۔ ہمارے گاؤں کی بیٹی کا بیاہ ہے۔ ہماری عزت ہے۔"

"ٹھیک ہے،" عباس نے کہا۔ "ابھی وقت نہیں گیا۔ ایک دِن بیچ میں ہے۔ کل اُٹھا دو۔ جگہ برات کے بیٹھنے کے لائق ہو جائے گی۔"

روڑی کے مالکان، جن کا خیال تھا کہ معاملہ ٹل جائے گا، اپنی سادگی میں بات کر کے پھنس گئے تھے۔ چاروں کے چاروں کمر پہ ہاتھ رکھے، اپنی ڈھیریوں کو یوں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جیسے پہلی دفعہ نظر آ رہی ہوں۔ پھر ایک نے دُوسرے سے کہا،

"کدھر کو لے جائیں؟"

"بِلّو رائیں نے ابھی چارہ کاٹا ہے،" عباس نے کہا، "اُس کے کھیت میں لگا دو۔"

"ہاں جی ہاں،" بلو ارائیں، جو پاس ہی کھڑا تھا، سر ہلا کر بولا۔ "میں حاضر ہُوں۔"

"تُو تو حاضر ہو گا بلو،" علی راٹھور خشمگیں نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "اُدھر سے اُٹھاتے اُٹھاتے آدھی روڑی تیری زمین میں رہ جائے گی، تو حاضر نہیں ہو گا تو اَور کیا ہو گا؟ اِتنا ہی دیانت والا ہے تو جو روڑی تیرے کھیت میں رہ جائے اُس کی قیمت چکا لے۔"

"غریب آدمی ہوں چوہدری علی، کُل آدھے کِلّے کی میری پیلی ہے، میں کہاں سے قیمت ادا کر سکتا ہوں؟"

"تالاب کے کنارے ڈال دو،" عباس نے کہا۔

"سارے گاؤں کی بھینسیں اُدھر نہاتی ہیں، آتے جاتے مُنہ مار مار کے صفایا کر دیں گی۔"

"تو کیا سارا دِن اِدھر کوے چڑیاں مُنہ نہیں مارتے؟"

"خدا کا نام لے چوہدری باس۔ بھینس میں اَور چڑی میں فرق تو دیکھ۔"

"اوئے باسے،" چاچا احمد دور سے پکارا، "دفعہ کر ان کمیوں کو، میں برود مار کے اِن کی ڈھیریاں اُڑا دوں گا۔ دیکھوں گا کیا کرتے ہیں۔"

"ابا تو چپ کر،" عباس نے کہا، "مجھے اِنتظام کرنے دے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چوہدری احمو، گسّہ نہ کر،" رحمن بھٹی بولا۔ "تیری بیٹی نہیں، ہماری بیٹی کا بیاہ ہے۔ ہم تو بات چیت کے ذریعے کوئی رستہ تلاش کر رہے ہیں۔"

"تیری بات چیت کا مجھے علم نہیں۔ میں نے رستہ بتا دیا ہے،" چاچا بدمزاجی سے بولا۔

"تلاب دُوسری طرف ہے،" ولی ڈوگر نے ایک دشواری کی نشاندہی کر دی۔

"ہاتھوں پیروں کی بات ہی ہے ناء،" عباس نے جواب دیا۔ "کچھ بندے میں دیتا ہوں، باقی کے تُم لے آؤ۔ مِل جل کر زمین صاف کر دیں گے۔"

"کچھ ریہڑے مِل جائیں تو کام جلدی ہو جائے۔"

"ریہڑوں، والے روڑی کو قریب نہیں آنے دیتے،" بلو ارائیں بولا، "دُگنے پیسے دو پھر بھی حامی نہیں بھریں گے۔"

"عیسائیوں کا ریہڑا بھی ہے، اُن سے لے لو،" عباس نے کہا، "پیسے میں دے دونگا۔"

اگلے روز بیس پچیس آدمیوں اور بچوں نے مِل کر نوکریوں، ہاتھ والی ریہڑیوں اور عیسائیوں کے ریہڑے کی مدد سے میدان کی ایسی شکل نکالی کہ جیسے وہاں گندگی کا کبھی نشان بھی نہ تھا۔ پھر بیلچوں والے دو چار آدمی لے کر عباس میدان کی اُونچ نیچ کو ہموار کروانے لگ گیا۔

"پلین کر دو۔ بالکل پلین ہو جائے جیسے سڑک ہوتی ہے۔"

جب میدان ہموار ہو چکا تو آسمان صاف دیکھ کر دریاں بچھا دی گئیں۔ دریوں کے اُوپر کرسیاں اوندھی کر کے رکھ دی گئیں تاکہ گاؤں کے بچے اُن پر کود کود کر خراب نہ کریں۔ صحن کی دریوں پر بارات کی عورتوں کا انتظام تھا۔ دریوں کے علاوہ چند پھولدار بھاری بھاری پایوں والی چارپائیاں بچھائی گئی تھیں جو معتبر عورتوں کی نشست کے لِئے مقرر تھیں۔ کچھ خاص مہمانوں کے طعام کی خاطر عباس نے دو بکرے مزید منگوائے تھے، جن کی چاچے احمد نے مخالفت کی تھی مگر عباس کے آگے اُس کی ایک نہ چلی تھی۔ نماز مغرب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے بارات آ پہنچی۔ اُن کے بیٹھنے کے اِنتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ عباس کے دوستوں میں تین سپاہی ایک موٹر سائیکل پر بیٹھ کر آئے تھے۔ اُن کے علاوہ ایک چھوٹا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھانیدار شادی میں شریک ہونے کے لِئے آیا تھا۔ وہ اپنے تعلق والے کسی آدمی سے کار اَور ڈرائیور مستعار لے کر آیا تھا، جو گاؤں سے نِکلنے والی کچی سڑک پر کھڑی تھی۔ اُدھر بارات کے ساتھ محکمہ انہار کا ایس۔ڈی۔او۔ اپنی چھوٹی سی فیئٹ کار میں آیا تھا جس میں اُس کے ساتھ دُولہا سوار تھا اَور پچھلی سیٹ پر دُولہے کی ماں اور بہنیں پھنس کر بیٹھی تھیں۔ اِس گاؤں میں یہ پہلا بیاہ تھا جس میں تین کاریں شامل ہُوئی تھیں اَور بارات کے ساتھ بینڈ باجے والوں کا دستہ آیا تھا۔ سرور راٹھور کا گاؤں تین کوس کے فاصلے پر پکی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ وہاں سے بینڈ والے تانگوں پہ، گاؤں کے چوہدری اپنی گھوڑیوں پہ اَور عام مدعوئین بیل گاڑیوں پر سوار ہو کر اَور کئی پیدل چل کر آئے تھے۔ اُن کے بیچ دُولہا کا سرخ پھنپھنوں والا سجا سجایا گھوڑا بے سوار آیا، جس کی باگ ایک کمی تھامے ہُوئے تھا۔ وہی کمی سر پہ ایک ٹوکرا اُٹھائے ہُوئے تھا جس میں تازہ پھولوں کا سہرا رکھا تھا۔ سب کو ہدایت تھی کہ وہ بیاسی کو جانے والی کچی سڑک کے سرے پر بوہڑ درخت کے نیچے جمع ہوں اَور اُس وقت تک ٹھہریں جب تک کہ بارات مکمّل نہ ہو جائے۔ لوگ آ آ کر دُولہا کی آمد کے انتظار میں وہاں بیٹھتے گئے۔ باجے والے اپنے اپنے ساز کے کل پرزے کستے ہُوئے بیچ بیچ میں کوئی اکلوتی تان بلند کرتے رہے۔ اِدھر بیاسی کے میزبانوں کو علم ہو چکا تھا کہ بارات پکی سڑک پہ جمع ہو رہی ہے۔ کبھی کوئی نائی کا لڑکا یا میراثی وہاں تک جاتا اَور اُنہیں دیکھ کر آتا۔ "آ گئے ہیں،" واپس آ کر وہ کہتا۔ سب مُنہ اُٹھا کر دیکھنے لگتے۔ چھ سات برس سے لے کر دس بارہ برس تک کے لڑکے بھاگتے ہوے جاتے اَور لوٹ کر اطلاع دیتے کہ "آ گئے ہیں،" اور پھر اُسی طرف کو بھاگ جاتے۔ پکی سڑک پر بوہڑ کے نیچے جب سب باراتی آ چکے تو آخر میں ایس۔ڈی۔او کی کار پہنچی جس میں دولہا اکرم راٹھور شادی کے کپڑے پہنے ننگے سر بیٹھا تھا۔ کار کے پیچھے پیچھے اکرم کا باپ سرور راٹھور اپنے سفید گھوڑے پہ نو سالہ نواسے کو اپنے پیچھے بٹھائے آ پہنچا۔ اکرم کار سے اُتر آیا۔ ٹوکرے میں سہرے والی پگڑی اُٹھا کر اُس کے سر پہ جمائی گئی اَور نو عمر بھانجے کا ہاتھ، جو خُود بھی چھوٹا سا دُولہا بنا ہوا تھا، اُس کے ہاتھ میں پکڑایا گیا۔ باجے والوں نے اپنے ساز زور شور سے بجانے شُروع کئے اَور یوں فضا کے اِس اِرتعاش سے بارات کی آمد کا باقاعدہ اعلان ہوا۔ میزبانوں میں اِضطراب کی ایک کیفیت تھی۔ اِنتظامات مکمّل تھے، مگر ہر کوئی، کسی خاص

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کام کے بغیر، آگے پیچھے دوڑنے بھاگنے میں لگا ہوا تھا۔ اُدھر بارات پکی سڑک سے اُتر آئی تھی اَور بینڈ باجے کی معیشت میں کچی سڑک پہ آہستہ آہستہ گاؤں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ دو ڈھائی سو گز کا یہ فاصلہ اُنہوں نے رُک رُک کر کوئی آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ اُن کے استقبال کے لِئے اعجاز اَور تھانیدار مجیب اللہ کے علاوہ گاؤں کے پانچ سات معزز لوگ موجود تھے۔ چاچا احمد اَور عباس دور دور ہی چل پھر رہے تھے۔ بارات کو درجہ بدرجہ کرسیوں، پلنگوں اَور دریوں پر بٹھا دیا گیا۔ بیٹھتے ہی دودھ کی کچی لسی سے بھرے گلاس اُن کی تواضع کے لِئے پیش کئے گئے۔ میٹھی لسی کے گلاس چڑھاتے چڑھاتے مردوں کی بارات پہ نسبتاً خاموشی چھا گئی۔ مگر صحن میں عورتوں کی ہلچل مچی تھی۔ ڈھولکی جو گزشتہ تین چار دِن سے وقتاً فوقتاً بجائی جا رہی تھی، اب مسلسل بج رہی تھی۔ میراثنوں کے ساتھ مِل کر گاؤں بھر کی لڑکیاں رخصتی کے گیت گا رہی تھیں۔ بارات کے ہمراہ آنے والی عورتیں بھی ایک ڈھولکی لے کر آئی تھیں۔ لڑکے اَور لڑکی والی ڈھولکیوں کا مقابلہ جاری تھا۔ ہر دو فریق ایک دُوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھے۔ عورتیں چیخ چیخ کر باتیں کر رہی تھیں۔ باہر باجے والوں نے یکے بعد دیگرے تین چار گانوں کی دُھنیں بجائیں اَور اپنے کمال کے عروج پر پہنچنے کے بعد رُک گئے۔ پسینہ اُن کے چہروں سے بہہ بہہ کر گردنوں کے راستے اُن کے سفید کوٹوں کی کالروں میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ باجے اَور طوطیاں ایک طرف رکھ کر اُنہوں نے اپنے لمبے لمبے میلے رومالوں سے پسینہ خشک کیا اَور دریوں پہ بیٹھ کر لسی کے گلاسوں سے پیاس بجھانے لگے۔ بینڈ کی جانب سے خاموشی ہوتے ہی بھانڈوں کی ٹولیاں آ گئیں جنہوں نے اپنا تماشا شُروع کر دیا۔ اُنہوں نے لڑکے والوں کی قوم، برادری اَور عادات و اطوار کے بارے میں اَیسے اَیسے لطیفے سنائے اَور پھبتیاں کسیں کہ عام حالات میں واجب القتل قرار پاتے، مگر اِس موقعہ پر بارات والوں نے ہنستے ہنستے دُولہا اَور اُس کے باپ کے سر سے وار وار کر نوٹوں کی ویلیں بھانڈوں کو دیں۔ بھانڈوں کی دو ٹولیاں تھیں۔ ایک چپ ہوتی تو دُوسری شُروع ہو جاتی۔ آخر جب لوگوں نے دیکھا کہ کافی ہو چکی تو بھانڈوں کو پکڑ کر نکال باہر کیا گیا۔ وہ کھانے کی اُمید میں مہمانوں سے ہٹ کر زمین پہ بیٹھ رہے۔ اب بارات کے آگے میزوں اور دریوں پہ دسترخوان بچھائے جانے لگے۔ اِسی دوران میں مغرب کی اذان ہو گئی۔ چند بزرگ اَور کچھ نماز روزے کے پابند نوجوان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اِجازت لے کر مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ گھر کے اندر ڈھولکی اَور عورتوں کی چیخ و پکار اُسی طرح قائم تھی۔ کچھ دیر کے بعد نمازی مسجد سے لوٹ آئے۔ نکاح تین ماہ پہلے، بات پکی ہونے کے ساتھ ہی خاموشی سے ہو چکا تھا۔ اب صرف کھانا کھانے کی دیر تھی اَور دُلہن کی رخصتی کا مرحلہ تھا۔ دسترخوان لگ گئے تھے، دیگیں دم پر لگائی جا چکی تھیں، پاس ہی تنور لگا تھا جہاں سے گرم گرم روٹیاں نکال کر بڑے بڑے چھابڑوں میں ڈھیر کی جا رہی تھیں۔ مگر کھانا شُروع نہ ہو رہا تھا۔ اصل میں ملک جہانگیر کا اِنتظار ہو رہا تھا۔ وہ چند روز پیشتر اعجاز کو ایک دُکھ بھرا پیغام بھیج چکا تھا۔ "ملک صاحب نے کہا ہے،" منشی نے آ کر بتایا تھا، "بیٹی کی رخصتی میری موجودگی کے بغیر نہ ہو۔ جیسے بھی ہو سکا میں آؤنگا۔ ہو سکتا ہے یہ آخری شادی ہو جس میں مَیں شمولیت کروں۔"

اِنتظار کرتے ہُوئے دس پندرہ مِنٹ گزُر گئے تو سب کو یہ بات بتا دی گئی۔ باراتیوں میں جو بے صبری کے آثار پیدا ہونے شُروع ہو گئے تھے، کچھ دیر کے لِئے رُک گئے۔ لوگوں نے آپس میں باتیں کرنا اَور پیٹ کو سہارا دینے کے لِئے مزید لسی مانگ کر پینا شُروع کر دی۔ اس کے کچھ ہی دیر کے بعد ایک گاڑی کی بتیوں کی روشنی کچی سڑک پہ آتی ہُوئی دکھائی دی۔ پنڈال سے کچھ فاصلے پر آ کر جیپ رُک گئی۔ چاچا احمد ایک طرف سے نمودار ہو کر آہستہ آہستہ گاڑی کی جانب بڑھا۔ اعجاز اُس سے پہلے جیپ تک پہنچ گیا۔ جہانگیر کو سہارا دے کر جیپ سے باہر نکالا گیا۔ زمین پہ پاؤں دھر کر وہ ایک موٹی سی چھڑی کی مدد سے ڈگمگاتا ہوا کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی اُس کے دو نوکر دائیں اَور بائیں بازو سے پکڑ کر چلاتے ہُوئے اُسے آگے لے کر آئے۔ سہاروں کے باوجود وہ قدم قدم، چیونٹی کی چال چل رہا تھا۔ عالمگیر، اعجاز اَور چاچا احمد اُس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھے ہُوئے آدھے لوگ اُٹھ کھڑے ہُوئے۔

"اِدھر آؤ ملک صاحب۔ یہاں تشریف رکھو،" درمیان والے آدمیوں نے اپنی کرسیاں پیش کیں۔

"بیٹھو بیٹھو جی،" اعجاز اُن سے بولا۔ "اور کرسیاں آ جاتی ہیں۔ جا اوئے زلفی، کرسیاں لے کر آ، آرام کرسیاں لے کر آ اندر سے۔" مگر اُن آدمیوں نے اِصرار کر کے جہانگیر اَور عالمگیر کو اپنی کرسیوں پہ بٹھا لیا۔ اَور خود سامنے کھڑے حال احوال پُوچھنے لگے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جہانگیر خاموشی سے سر ہلا کر جواب دیتا رہا۔ پھر اُس نے سر ہلا کر چاچے احمد سے پُوچھا۔

"سب کام ٹھیک ہو گیا ہے؟"

"اللہ کے فضل سے،" چاچے احمد نے جواب دیا۔

جہانگیر نے پہلی بار مُنہ کھول کر بات کی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ تو وہ پہلے ہی تھا، اَور اب اُسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہاتھ لگانے سے ہی مسمار ہو جائے گا۔ پھر بھی اعجاز کو خیال نہ تھا کہ اُس کی آواز، جو اُس کی شخصیت کا اہم جزو تھی، اتنی ناتواں ہو چکی ہو گی کہ مشکل سے کانوں تک پہنچے گی۔

"اللہ راکھا" جہانگیر نے دوبارہ ہاتھ اُٹھا کر کہا، اَور خاموش ہو گیا۔

دیگوں کے ڈھکنے اُٹھے اَور فضا میں بکھری ہُوئی کھانے کی دھیمی دھیمی خوشبو تیزی سے چاروں طرف پھیل گئی۔ دیگی لوہے سے کفگیر ٹکرانے کی مخصوص آوازیں بلند ہونا شُروع ہو ئیں۔ پلیٹوں کے چھوٹے چھوٹے مینار دسترخوانوں کے کناروں پر لا کر رکھ دیئے گئے۔ چند مِنٹ کے اندر کھانے کی بڑی بڑی طشتریاں مہمانوں کے آگے پہنچ گئیں۔ باراتی، جن کی اشتہاء عروج پر تھی، کھانے پر پل پڑے۔ عشاء کی اذان ہُوئی، مگر نماز کے لِئے پوری رات پڑی تھی۔ صرف اعجاز نے ایک بچے کو اِمام صاحب کی جانب پیغام دے کر دوڑایا کہ نماز سے فارغ ہوتے ہی طعام میں شرکت کے واسطے تشریف لے آئیں۔

صحن میں عورتوں کا شور اُسی طرح جاری تھا۔ آٹھ دس نوجوان لڑکوں نے مسمار شدہ دیوار تک قطار بنا کر کھانے کی طشتریاں اندر پہچانے پر اپنے آپ کو معمور کر لیا تھا۔ دیوار کے دوسری طرف اِسی طرح نوجوان لڑکیوں کی ایک قطار بنی تھی جو پلیٹیں اَور طشتریاں پکڑ پکڑ کر صحن میں مہمان عورتوں کے آگے رکھتی جا رہی تھیں۔ مردوں، عورتوں اَور بچوں کے ہجُوم میں معلوم ہوتا تھا کہ صرف یہی دو ٹولیاں ہیں جنہیں نہ بھوک محسوس ہو رہی تھی نہ کھانے کی فکر تھی۔ لڑکوں نے خوب اِستری کی ہُوئی سفید شلوار قمیض کے سوٹ اور کئی ایک نے بوسکی کی قمیضیں پہن رکھی تھیں۔ اُنہوں نے سر میں تیل ڈال کر کنگھی سے بال جمائے تھے اَور چند ایک نے گلے میں پھولوں کے ہلکے ہار پہنے ہُوئے تھے۔ لڑکیاں رنگ برنگ ریشمی کپڑوں میں ملبوس تھیں جو گیس لیمپوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ برتنوں کی کھنک کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار اَور نوجوان شرمیلی ہنسی کی آوازیں بلند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو رہی تھیں۔ لڑکوں اَور لڑکیوں کی آنکھوں میں چاہت کی چمک تھی۔ عالمگیر جو اِن لڑکوں لڑکیوں سے چند سال بڑی عمر کا تھا، لبوں پہ ہلکی مسکراہٹ سے کنکھیوں سے اُن کی جانب نگاہیں پھینک رہا تھا۔ مگر اُس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا ہوا جہانگیر، لقمے منہ میں ڈالتا ہوا، ٹکٹکی باندھے اُن نوجوانوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اگر کوئی آس پاس سے جہانگیر کے ساتھ مخاطب ہو کر بات کرنے کی کوشش کرتا تو عالمگیر اُس کے بازو پہ نرمی سے ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں کہتا کہ ملک صاحب کو باتیں کرنے سے تھکاوٹ ہو جاتی ہے، جسے سن کر مخاطب کرنے والا پیچھے ہٹ جاتا، یا عالمگیر سے بات شُروع کر دیتا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اب کھانے کی رسد ختم کر کے ٹوٹی ہُوئی دیوار کے آر پار کھڑے باہم باتیں کرنے کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ اچانک کسی بات پہ لڑکوں کے غول سے بلند قہقہوں کی آواز اُٹھی اَور لڑکیوں کی طرف سے چیخ نما ہنسی پیدا ہُوئی۔ پنڈال میں بیٹھے ہُوئے سب ثانیتہً اُن کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"اوئے مسخریاں بند کرو،" اعجاز نے دور سے آواز دی۔ "چلو اُدھر چل کر بیٹھو،" وہ ہاتھ سے ہانکنے کا اشارہ کرتے ہُوئے بولا، "چلو چلو چلو۔"

لڑکیاں سر نیچے کر کے دیوار کے پیچھے چھپ گئیں۔ لڑکے مُنہ موڑ کر آہستہ آہستہ چند قدم پیچھے کو چلے۔ جیسے ہی اُنہوں نے اعجاز کی توجہ دُوسری طرف مبذول ہوتے دیکھی، فوراً پلٹے اَور وہیں آ کھڑے ہُوئے جہاں پرلی طرف لڑکیاں اپنے مورچے پر قائم تھیں۔ جہانگیر اپنے آگے رکھا بکرے کے گوشت کا سالن اَور روٹی کھاتے کھاتے برابر اِس سارے تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اعجاز نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جہانگیر کی کرسی کے عقب میں گاؤں کے دس بارہ کتے اَور پانچ چھ بلیاں جمع تھیں۔ اعجاز کو اُن کی موجودگی کا علم اُس وقت ہوا جب ایک بار کتے بلیوں پر حملہ آور ہُوئے اَور دونوں نے مِل کر آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ جہانگیر روٹی کا نوالہ توڑتا اَور اُسے شوربے میں بھگو کر منہ میں رکھ لیتا۔ مگر اُس کے جبڑے روٹی کو چبانے کے لِئے متحرک نہ ہوتے۔ اس کی بجائے یوں دکھائی دیتا کہ وہ اُس نوالے کو چوس رہا ہے۔ ایک دو مِنٹ کے بعد وہ روٹی کے ٹکڑے کو اصلی حالت میں مُنہ سے اُگلتا اَور اُنگلیوں میں پکڑ کر عقب کی جانب اُچھال دیتا۔ کتے اُس پہ جھپٹ پڑتے۔ اِسی طرح وہ گوشت کی ایک بوٹی اُٹھا کر مُنہ میں رکھتا، کچھ دیر تک اُسے چوستا رہتا، پھر نکال کر پیچھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھینک دیتا۔ کتوں کو کسی نہ کسی طور علم ہو جاتا کہ ہوا میں اچھلا ہوا ٹکڑا روٹی کا ہے یا گوشت کا، اَور گوشت کی بوٹی پر وہ واضح تندی سے حملہ آور ہوتے۔ اِس کارروائی کے دوران جہانگیر نہ روٹی کو دیکھتا نہ میز پہ رکھی ہُوئی گوشت کی پلیٹ کو اَور نہ ہی وہ اپنے پیچھے کتوں بلیوں پہ نظر ڈالتا، بلکہ اندھوں کی مانند ہاتھ سے ٹٹول کر روٹی توڑتا اَور بوٹی اُٹھاتا، مُنہ میں چوس کر اُسے پیٹھ کے پیچھے گرا دیتا۔ یوں وہ برابر اپنے سامنے لڑکے لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے، جو اب کاغذ کے چھوٹے چھوٹے گولے بنا کر ایک دُوسرے پر پھینک رہے تھے، اِس عمل کو مکمل کرتا اَور اِسے دہرائے جاتا۔ اُس شخص کو جس نے اِنتہائی وضعداری سے اپنی زندگی گزاری تھی اب اِس بات کا ذرہ برابر خیال نہ رہا تھا کہ لوگ اُس کی ٹکٹکی کو نامناسب خیال کر رہے ہوں گے۔ اُس کی نظروں میں لپک اَور لچک، لالچ اَور لجاجت۔۔۔۔۔ زندگی اَور موت کا ایک اَیسا ملا جلا تاثر تھا جو اعجاز کے تصور پہ ثبت ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مسحور ہو کر جہانگیر کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ ایک باراتی نے آ کر اعجاز سے بات شُروع کر دی اَور یوں اُس کی توجہ جہانگیر سے ہٹی۔ جب جہانگیر ختم کر چکا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے برتن اُٹھانے کو کہا۔ ایک آدمی لوٹا، صابن دانی، تولیہ اَور چلمچی لے کر آیا۔ ہاتھ دھو کر جہانگیر نے عالمگیر سے اعجاز کو بلانے کے لِئے کہا۔ عالمگیر نے ایک نوکر کو بھیجا۔ اعجاز گھر کے صحن سے نِکل کر آیا۔ جہانگیر کے پاس آ کر وہ اُس کی بات سننے کو جھکا تو ایک آدمی نے کرسی لا کر اعجاز کے پیچھے رکھ دی۔ جہانگیر نے جیب سے نقدی کے دو تین بڑے نوٹ نکالے اَور اعجاز کی جانب بڑھائے۔

"احمد خاں تو اُلٹے دماغ کا آدمی ہے، کبھی گرم، کبھی سرد۔ یہ لو۔ بیٹی کو جا کر دے دو۔"

"اِس کی کیا ضرورت ہے بھائی جہانگیر۔ آپ بیماری میں اُٹھ کر آ گئے ہیں، ہماری عزت دُگنی ہو گئی ہے۔ بس اِسی سے ہماری بیٹی کا بیاہ رچ گیا ہے۔"

"اُوں ہُوں۔" جہانگیر نے نفی میں سر ہلاتے ہُوئے نوٹ اعجاز کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ "یہ تُمہاری ڈیوٹی ہے، بیٹی کے ہاتھ میں جا کر پکڑاؤ۔ یہ اُس کا حق ہے۔ سمجھ گئے؟" پھر اُس نے دو نوٹ عالمگیر کے ہاتھ میں دیئے۔ "لو عالم۔ لڑکے کو سلامی دے آؤ۔"